بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

ترجمان القرآن کی اشاعت کو اب پورے تین سال گذر چکے ہیں۔ اور محرم ۵۵ھ سے اس کی زندگی کا چوتھا سال شروع ہو رہا ہے۔ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے جو انعامات ہوئے ہیں ان کا شکر بجا لانا میرا پہلا فرض ہے۔ اول تو یہی احسان کیا کم ہے کہ ایک حقیر گنہگار بندے کو دین حق کی خدمت کے لیے منتخب فرمایا گیا، حالانکہ اگر انتخاب کا مدار علم، تقویٰ، اخلاص اور کمالات ظاہری و باطنی پر ہوتا تو شاید میں آخری شخص ہوتا جس کی طرف نگہ انتخاب مائل ہوتی۔ پھر اس پر مزید احسان یہ ہے کہ میری تمام کوتاہیوں کی تلافی اپنے فضل و انعام سے کی گئی۔ بے علم تھا، تو علم عطا کیا گیا، ناواقف راہ تھا، راہ راست کی طرف ہدایت بخشی گئی۔ کمزور اور پست ہمت تھا، صبر و ثبات اور استقامت کی توفیق دی گئی، بے سرو سامان اور بے یار و مددگار تھا، خزانہ غیب سے ہر ہر قدم پر سرو سامان بہم پہنچایا گیا، اور ہر مشکل کو ایسے ایسے طریقوں سے آسان کیا گیا کہ میری فکر و تدبیر کا اس میں کچھ بھی دخل نہ تھا۔ یہ تو وہ احسانات ہیں جن کو میں جانتا ہوں، اور ان کا بھی پورا پورا شکر ادا کرنا میری قدرت

سے باہر ہے ۔ رہے وہ بے شمار احسانات جن کی مجھ کو خبر تک نہیں ، تو ان کا شکر کیسے بجا لاؤں۔ بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمتہائے تو

مگر حق تعالیٰ اپنے فضل و احسان میں جیسا فیاض ہے، یہ بندہ اس سے فضل و احسان کی طلب میں ویسا ہی حریص ہے۔ اس نے جو کچھ دیا ہے اس پر شکر ضرور ہے مگر قناعت نہیں۔ خدا کے مقابلہ میں قناعت کیسی؟ اس کو اپنے غنا پر ناز ہے تو بندے کو بھی اپنے فقر پر ناز ہے۔ اس کا فیض بے پایاں ہے تو بندے کی احتیاج بھی بے پایاں ہے۔ وہ دینے سے نہیں تھکتا تو بندہ مانگنے سے کیوں تھکے؟ اور اس سے نہ مانگے تو پھر کس سے مانگے؟ میں علم کا پیاسا ہوں، اور اس پیاس کو بجھانے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ میری عقل و فہم میں ہزاروں کوتاہیاں ہیں اور ان کو دور کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہی ہے۔ میرا دل بے چین ہے، میری روح مضطرب ہے، میرا دماغ سکون سے محروم ہے، خدا ہی ہے جو اس بیماری کا مداوا کر سکتا ہے۔ میں گنا ہوں میں گھرا ہوا ہوں، میرے عمل میں لاکھوں خامیاں ہیں، میری فطرت کی کمزوریاں قدم قدم پر مرضاتِ الٰہی کے اتباع سے مجھ کو روکتی ہیں۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جو میرے ان عیوب کی اصلاح کرے اور عمل صالح کی توفیق بخشے۔ میں اس سے خلوصِ نیت کا طلب گار ہوں، صحتِ فکر اور سدادِ نظر مانگتا ہوں۔ الحب فی اللہ والبغض للہ کی توفیق چاہتا ہوں۔ میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے بندوں سے بے نیاز کر کے صرف اپنا نیازمند بنائے، محبت اور خوف اور طمع کا تعلق سب سے توڑ کر صرف اپنے ساتھ جوڑ دے، اور اتنی قوت و طاقت عطا فرمائے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنے دل کے سب حوصلے نکال سکوں۔ وَادْعُوا رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا۔

ماہ گذشتہ میں میری صحت کی خرابی اس حد تک پہنچ گئی کہ مجبوراً رسالہ کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی۔ اگرچہ یہ التوا مجھ کو بھی ناگوار ہوا، اور ترجمان القرآن کے ان ناظرین کو بھی ناگوار ہوا ہوگا جو گہری دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ اشاعت روکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ رسالہ جس معیار پر مرتب کیا جا رہا ہے اس کو برقرار رکھنا اور جو مقصد اس کے پیش نظر ہے اس کو پورا کرنا ایک تنہا انسان کے بس کا کام نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اہل علم اور اہل درد اصحاب کی ایک اچھی خاصی جماعت مسائل کی تحقیق اور مضامین کی تحریر میں مدد دینے والی ہو۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ جماعت تو درکنار، ایک شخص بھی مستقل طور پر میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ کمی اشاعت کی وجہ سے رسالہ کی مالی حالت ایسی نہیں کہ کوئی مددگار رکھا جا سکے اور بدقسمتی سے رسالے کے قلمی معاونین کا حلقہ بھی تنگ ہے۔ تنہا میری ذات پر رسالہ کی ادارت کا پورا بار پڑ گیا ہے۔ مسلسل تین سال سے اس محنت شاقہ کو برداشت کر رہا ہوں، اور اس مدت میں ایک دن بھی مجھ کو آرام نصیب نہیں ہوا ہے۔ ایک انسان زیادہ سے زیادہ جتنا کام کر سکتا ہے، وہ اب تک میں نے کیا اور انشاء اللہ آئندہ بھی کروں گا، مگر اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے دل اور دماغ کی تمام قوتیں جواب دے رہی ہیں۔ گذشتہ مہینہ یہ کیفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مجبوراً مجھ کو بالکل کام چھوڑ دینا پڑا۔ اب پھر اپنے اندر کچھ قوت پاتا ہوں، اور اللہ کی مدد کے بھروسہ پر کام شروع کر دیا ہے۔ اگر بارگاہ خداوندی میں یہ کام مقبول ہے تو یقیناً اس کو جاری رکھنے کے لیے وہیں سے کوئی انتظام ہو جائے گا۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔ وَاِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّہٗ ھُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۝

پچھلے دنوں تبدیل آب و ہوا کے لیے بیدر اور اس کے نواحی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ شہر تقریباً دو سو برس تک اسلامی تمدن و تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ بڑے بڑے علماء، صلحاء، سپہ سالار

اور مدبرین دولت اس کی خاک میں مدفون ہیں۔ میلوں تک اُن آثار کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو اب بھی اپنے بنانے والوں کی عظمت پر شہادت دے رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ اسلاف کی عظمت رفتہ اینٹ و پتھر کی صورتوں میں زندہ اور انسانی شکلوں میں مردہ ہے۔ جن ناموروں نے اس سرزمین میں اپنی شوکت وحشمت کے یہ زندہ آثار چھوڑے ہیں۔ ان کی جسمانی یادگاریں اب بھی وہاں موجود ہیں، مگر ان میں زندگی نہیں۔ ان کے علوم وفنون مرگئے، ان کے کمالات مرگئے، ان کے دل مرگئے، ان کی روحوں پہ مردنی چھاگئی۔ اس قدیم اسلامی بستی میں آنکھوں نے تلاش کیا کہ کوئی عالم نظر آئے، کوئی باخدا بزرگ ملے، کوئی فنون قدیمہ کا ماہر دکھائی دے کوئی ایسا باکمال انسان ملے جس کے وجود کو دیکھ کر کم از کم دل کو یہ دھوکہ ہی دیا جا سکے کہ اسلامی تہذیب و تمدن میں ابھی کچھ زندگی باقی ہے، لیکن ہر جستجو میں نگاہیں ناکام ہوئیں، اور دل نے گواہی دی کہ اسی کو قوموں کی موت کہتے ہیں۔

ہندوستان کی سرزمین کا کونسا چپہ ہے جس پر مسلمانوں نے اپنی بزرگی کے نقوش نہیں چھوڑے تھے مگر وہ مر گئے اور اپنے ساتھ اپنی بزرگی کو بھی لے گئے۔ اب ہماری بستیوں کو دیکھئے تو خون اور گوشت کے چلتے پھرتے مجسمے لاکھوں نظر آئیں گے، مگر اہل کمال مفقود، اہل دل ناپید، نظم ملت پراگندہ، روح ملت افسردہ۔ کہیں اگر دور سے کچھ نظر فریب چمک دمک نظر آتی بھی ہے، تو قریب جا کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنا کمال نہیں محض دوسروں کے کمالات کا عکس ہے، اور عکس لینے میں بھی اپنی بے کمالی نمایاں ہو رہی ہے۔

یہ دیکھکر البتہ خوشی ہوی کہ بیدر میں بعض افراد اپنی قوم کی اس پستی کا احساس رکھتے ہیں اور مردوں میں زندگی کی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔

اس گئی گذری حالت میں بھی شاید مسلمانوں کی کوئی بستی ایسی نہ ہوگی جس میں کم از کم دو چار دردمند دل نہ پائے جاتے ہوں۔ بڑے شہروں کی حالت تو بظاہر مایوس کن ہے لیکن چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں ایسے لوگوں کے لیے کام کرنے کے مواقع بہت زیادہ ہیں۔ اگر ایک ایک بستی میں ایک بھی سچا درد رکھنے والا مسلمان اس جد و جہد کے لیے کمربستہ ہوجائے تو مسلمانوں میں نظم اور نظم میں حیات پیدا ہوسکتی ہے۔ اسلام نے تو ہمارے کام کو بہت ہی ہلکا کردیا ہے۔ ہمیں صرف دو چیزوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک اقامت صلوٰۃ۔ دوسرے ایتائے زکوٰۃ۔ اسلام کے یہ دو ارکان مضبوطی کے ساتھ قائم کردیجئے۔ پھر دیکھئے کہ پراگندہ افراد خود جماعت بنتے ہیں، جماعت میں خود بخود زندگی کی حرکت پیدا ہوتی ہے، حرکت آپ سے آپ قوت پیدا کرتی ہے، اور قوت بالطبع ترقی کی جانب قدم بڑھاتی ہے۔ پراگندگی بے سروسامانی اور اخلاقی و روحانی انحطاط کی کوئی حالت اس حالت سے بڑھ کر متصور نہیں ہوسکتی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں پائی جاتی تھی۔ مگر وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے ان تمام کمزوریوں کو دور کرکے عرب کو ایک طاقتور قوم بنادیا؟ یہی دو چیزیں۔ انہی پر قرآن میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ انہی کو قائم کرنے پر نبی اکرم اور صحابۂ کرام نے سب سے زیادہ اپنی قوت صرف کی انہی دونوں پر اسلامی عظمت کی عالمگیر عمارت قائم ہوئی ہے۔ یہ وہ ارکان ہیں جن کا انہدام اسلام کا انہدام ہے۔ عہد رسالت اور عہد صحابہ پر نظر کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ اس دور میں اسلام اور اقامت صلوٰۃ لازم و ملزوم تھے اور کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ مسلمان تارک الصلوٰۃ ہو۔ ایتائے زکوٰۃ کی اہمیت کا یہ حال تھا کہ سرکار رسالت مآب کی رحلت کے بعد جن لوگوں نے اس رکن اسلام کو منہدم کرنا چاہا، ان پر صدیق اکبر نے تلوار کھینچ لی اور اس طرح ان سے جنگ کی جیسے کفار سے کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ کس لیے تھا؟ محض اس لیے کہ نماز اور زکوٰۃ کے مٹ جانے کے بعد اسلام کا عدم و وجود

برابر ہو جاتا ہے ایمان کا شعلہ بجھنے لگتا ہے۔ اخلاق فاسد ہو جاتے ہیں، جماعت کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے، باہمی تعاون کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے، اور آخرکار امت کی حالت وہ ہو جاتی ہے جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پس جو لوگ حقیقت میں اسلامی جمعیت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں انہیں کسی نئے پروگرام کی ضرورت ہی نہیں۔ اسلام کی فطرت سے جو جمعیت مناسبت رکھتی ہے اس کے لیے صحیح ماڈل نہ تو نازی اور فاسسٹی ہے اور نہ خاکساری و خدائی خدمتگاری بلکہ اس کا صحیح ماڈل وہی مدنی و محمدی ہے، اور اس کے لیے صرف اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کا پروگرام کافی ہے۔

ایک مہلک مرض جو مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو گھن کی طرح کھا گیا ہے، اور کھائے جا رہا ہے "وراثت" کا مرض ہے۔ سب سے پہلے اس نے ہمارے نظام سیاست کو خراب کیا۔ اس کے بعد یہ گھاس تلے کے پانی کی طرح ہمارے نظم ملت کے ہر شعبے کی جڑوں میں پھیلتا چلا گیا اور ہماری قوت کے جتنے مرکز تھے ان سب کو اس نے فاسد کر دیا۔ اسلام میں تو نبی کا بیٹا بھی وراثت میں نبوت نہیں پاتا مگر یہاں وراثت کا قانون ایسا عالمگیر ہوا ہے کہ عالم کا بیٹا عالم ہے، مرشد کا بیٹا مرشد، قاضی کا بیٹا قاضی، امام کا بیٹا امام اور سپہ سالار کا بیٹا سپہ سالار۔ ہر شخص جس نے اپنے فضل و کمال سے جماعت میں اپنا ایک ممتاز مقام پیدا کیا، اس کی ایک باقاعدہ مسند بن گئی، اور اس کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں کا اس مسند پر بیٹھنا لازم ٹھیر گیا، خواہ ان میں اہلیت ہو یا نہ ہو۔ وراثت کے اس غلط اور جاہلانہ طریقے نے اتنا زور پکڑا کہ جوہر کمال بے قیمت ہو گیا اور اکثر و بیشتر دینی و اجتماعی خدمات جن کی بجا آوری پر تمام ملت کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے، محض نسبی استحقاق کی بنا پر نا قابل لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ علماء کا اصلی کام علم حق کا پھیلانا تھا۔ مگر جب علم کے خانوادے بن گئے تو

علمائے حق کے بے علم جانشینوں نے جہالت کی تاریکی پھیلائی اور مسلمانوں کو گمراہ کر دیا۔ مرشدوں کا اصلی منصب تزکیہ نفوس اور فضائل اخلاق کی اشاعت اور خلق اللہ کی ہدایت تھا، مگر جب مسند ارشاد ورثہ میں منتقل ہونے لگی تو ارشاد غائب ہو گیا، اور اس مسند کے وارثوں کا کام صرف یہ رہ گیا کہ دست و پا کو بوسے دلوائیں، مریدوں، معتقدوں اور زائروں سے نذرانے وصول کریں، اور استخواں فروشی سے جو مال حاصل ہو اس کو فسق و فجور کی نذر کر دیں۔ قضاۃ اس لیے تھے کہ شریعت کی حدود قائم کریں، مگر جب منصب قضا مال و جائداد کی طرح باپوں سے بیٹوں کو ترکے میں ملنا شروع ہوا تو قاضیوں کا کام یہ ہو گیا کہ بزرگوں کی معاشوں سے داد عیش دیں اور اقامت حدود کے لیے سعی کرنا تو درکنار، خود اپنے کرتوتوں سے شریعت کی ایک ایک حد کو توڑ ڈالیں یہی انجام دوسرے اہم مناصب کا بھی ہوا۔ مساجد کو مسلمانوں کی آبادیوں میں جو مرکزیت حاصل تھی وہ نالائق اماموں اور متولیوں کے ہاتھوں قریب قریب فنا ہو گئی۔ اوقاف اسلامی جو کبھی خیرات و حسنات کے منابع تھے، اسی منحوس وراثت کی بدولت تباہ ہو گئے۔ اسلام کا عسکری نظام جس کی ہیبت و جبروت سے روئے زمین کانپ اٹھتا تھا۔ اسی وجہ سے غارت ہوا کہ امارت و قیادت کے اہم مناصب خاندانوں کی میراث بن گئے غرض اسلامی تہذیب و تمدن کو اس چیز سے جتنے شدید نقصانات پہنچے اور پہنچ رہے ہیں۔ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ جدھر نظر کی جاتی ہے، دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کے بڑے بڑے وسائل پر ایسے لوگ قابض پائے جاتے ہیں جو خود فساد کے سرچشمے اور مفاسد کی پشت پناہ بنے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ اس سد راہ کو پوری قوت کے ساتھ اکھاڑ نہ پھینکا جائے۔

آخری دور کے بادشاہوں اور امراء و حکام نے کچھ تساہل، کچھ ناعاقبت اندیشی، اور

کھ بیجا فیاضی کی بنا پر یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علماء، مشائخ، قضاۃ، ائمہ اور دوسرے اہل مناصب کے لیے جاگیریں اور معاشیں مقرر کیں اور ان مناصب کو موروثی بنا دیا۔ اُس دور کے عام مسلمان بھی فقدان علم اور عدم تدبّر کی وجہ سے اسی غلطی میں مبتلا ہوئے اور اپنی عقیدتوں کو باکمال بزرگوں کے بعد ان کے بے کمال جانشینوں کی طرف منتقل کرتے چلے گئے۔ اس کے بُرے نتائج کو انہوں نے نہ سمجھا، یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن آج وہ نتائج بے نقاب ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص شریعت یا رسم و رواج کی آڑ لیکر اس غلط قاعدے کی حمایت کرتا ہے تو اس کی عقل پر ہزار افسوس ہے۔ رواج کی آڑ تو مسلمانوں کی زندگی میں سب سے زیادہ بے اصل اور بودی آڑ ہے۔ کوئی غلطی محض اس بنا پر برقرار رہنے کی مستحق نہیں ہوسکتی کہ اس کا ارتکاب سو دو سو یا ہزار برس پہلے کیا گیا تھا۔ رہی شریعت تو اس کی نگاہ میں ہر چیز سے زیادہ اہم اور اقدم دین کی مصلحت اور امت کی بہتری ہے۔ اگر شرعی قانون کے مطابق کوئی فعل کیا گیا ہو اور بعد میں ثابت ہو جائے کہ وہ فعل مصلحت دینی کے خلاف اور جماعت کے لیے مضر تھا تو اس فعل کے جاری رکھنے کے لیے یہ کوئی محکم دلیل نہیں ہے کہ اصطلاحی حیثیت سے وہ فعل شرعی قانون کے مطابق کیا گیا تھا۔ خود شرعی قانون ہی اس کی اجازت دیتا ہے کہ ایسے فعل کو مٹا دیا جائے۔

ناظرین ترجمان القرآن اس سے باخبر ہیں کہ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی آجکل انگریزی زبان میں قرآن مجید کا با تفسیر ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کام کے لیے ان کو لین (Lane) کی مشہور انگریزی لغت (Arabic English Lexicon) کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کتاب کو فروخت کرنا چاہیں تو مولانا سے دریاباد ضلع بارہ بنکی کے پتہ پر مراسلت فرمائیں۔